آزما ختم ہوا اور ہم سمجھے کہ قدرت نے ادارہ کو ایک عظیم دور ابتلا و محن سے کامیاب گذار دیا۔

جنگ کے اختتام پر بھی اس کے اثرات بدستور باقی رہے لیکن ادارہ ان پر بھی عبور پانے میں ناکام نہیں ہوا۔ اس نے ان حالات میں نہ صرف یہ کہ اپنے وجود کو قایم رکھا بلکہ وہ ترقی کرتا رہا ارباب نظر کے حلقہ میں برہان کی مقبولیت بڑھتی رہی اور اس کی وجہ سے اس کی اشاعت میں روز بروز اضافہ ہوتا رہا۔ اسی طرح ادارہ کی مطبوعات کا چرچا نہ صرف اس وسیع وعریض ملک کے گوشہ گوشہ میں ہوا بلکہ بیرون ہند۔ افریقہ، یورپ اور مشرق وسطےٰ تک سے ان کے آرڈر آئے اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اگرچہ ادارہ اپنے لئے کوئی محفوظ سرمایہ مہیا نہیں کرسکا لیکن اخراجات کے ساتھ ساتھ آمدنی بھی بڑھتی رہی اور اس بنا پر ادارہ کے کام کسی خاص اضطراب و پریشانی کے بغیر چلتے رہے۔

ادارہ کو قایم کرتے وقت ہم نے اسلام اور مسلمانوں کی دینی اور علمی خدمت کا جو ایک وسیع پروگرام بنایا تھا اس کے متعدد اہم اجزا اب تک تشنۂ تکمیل رہے تھے ادارہ کی اس مقبولیت عام اور اس کی ہمہ گیر شہرت و پسندیدگی کو دیکھ کر امید ہو چلی تھی کہ اب پروگرام کے باقیماندہ اجزاء کی تکمیل بھی ہو سکیگی اور ہم نے اس کے لئے اپنی صلاحیتوں اور ہمت و حوصلہ کی منتشر طاقتوں کو یکجا کر کے نئی امنگ اور نئے ولولہ کے ساتھ کام کرنیکا عہد بھی کر لیا تھا۔ لیکن آہ صد افسوس !

ما درچہ خیالیم و فلک درچہ خیال

یہاں کس کو یہ تصور ہوسکتا تھا کہ ملک کی آزادی کے شادیانے مسرت ندوۃ المصنفین ایسے ادارہ کے لئے قیامت کا نفخ صور ثابت ہوں گے اور جشن حریت و استقلال میں روشن ہونے والے چراغوں کے شعلے اس کے خرمن ہستی پر برق شرربار بن کر گریں گے !

یرید المرء ان یعطی مناہ ویابی اللہ الا ما یشاء

ہم کارکنان ادارہ میں ہزار عیب اور کوتاہیاں ہوں لیکن اتنی بات تو برہان کے گذشتہ

پرچوں کے ایک ایک صفحہ سے ظاہر ہے کہ ندوۃ المصنفین کی دہ سالہ زندگی میں بعض اوقات شدید سے شدید نامساعد حالات سے سابقہ پڑا لیکن ہم نے ایک لمحہ کے لئے صبر و استقلال کا دامن نہیں چھوڑا اور ایک لحظہ کے لئے کسی کے سامنے دریوزہ گری کے ہاتھ پھیلا کر اپنی خودداری کو مجروح نہیں ہونے دیا۔ خدائے علیم و خبیر خوب جانتا ہے کہ ہم نے اس ادارہ کو اپنے پاس ملت اسلامیہ کی ایک امانت سمجھا اور اپنی ذاتی منفعت و آسائش سے بے نیاز و بے پروا ہو کر اور متوسط زندگی کی بنیادی ضروریات پر قانع ہو کر اس کی خدمت و حفاظت کرتے رہے۔ ہم کو یقین تھا کہ کسی قومی اور جماعتی خدمت کو خاموشی سے سرگرمی محنت و دیانت اور خلوص و للہیت سے سے انجام دینا ہی اس کی ترقی اور کامیابی کی ضمانت ہے اس کے لئے بلند بانگ دعووں اور پے در پے امداد کی اپیلوں کی ہرگز کوئی ضرورت نہیں ہے ہم برابر اسی اصول پر عامل رہے اور خدا کا شکر ہے کہ اس نے ہماری یہ وضع نباہ دی۔

لیکن ۱۵ر اگست ۴۷ء کے بعد سے اب جو انقلاب پیدا ہوا ہے اور جس نے اس ملک کی زمین و آسمان کو ہی یکسر الٹ پلٹ کر رکھ دیا ہے اس نے ہمارے لئے ابتلاء و آزمائش کا ایک ایسا میدان مہیا کر دیا ہے کہ اب ہم محسوس کرتے ہیں ہمارے پاؤں کی طاقت رفتار روز بروز کم ہو رہی ہے اور دوسری جانب اس سنگلاخ میدان کی وسعتیں روز بروز سمٹنے کے بجائے اور پھیلتی جا رہی ہیں ایک طرف حالات کی ناسازگاری اور عدم مساعدت کا یہ عالم ہے کہ انہیں ہر گھڑی اشتداد پیدا ہو رہا ہے اور دوسری جانب محسوس ہوتا ہے کہ ہماری تاب مقاومت اپنے ترکش کے آخری تیر استعمال کرنے پر مجبور ہو گئی ہے اگر یہ کشمکش اسی طرح جاری رہی تو کون کہہ سکتا ہے کہ ادارہ کے پر از امید خوابوں کی تعبیر کیا ہو گی اور دس سال تک دیرینہ آرزوؤں اور تمناؤں کے جس پودے کو ہم اپنے خون جگر سے سینچتے رہے حوادث و آلام کی گرم و تیز ہواؤں میں اس کا کیا انجام ہو گا! چونکہ حالات امید افزا اور حوصلہ پرور نہیں۔ بلکہ مایوس کن اور ہمت شکن ہیں اسی لئے آج ہم اپنی دیرینہ وضع کے خلاف اس پر مجبور ہیں کہ ادارہ کے صحیح حالات سے پبلک کو باخبر کر دیں تاکہ خدا

نخواستہ اگر ہماری طاقت برداشت کے ترکش کا آخری تیر بھی کام رہا اور اس ادارہ کو بند ہو جانا پڑا تو کل کسی کو اس کی شکایت نہ ہو کہ ادارہ چپ چپاتے بند ہو گیا اور ہمیں اُس کی مشکلات کا علم بھی نہیں ہوا کہ ہم اُس کے لئے کوئی کوشش اور تگ و دو کرتے۔

جیسا کہ ابھی عرض کیا گیا یہ واقعہ ہے کہ ادارہ کا کوئی محفوظ سرمایہ نہیں تھا اس کی جو کچھ پونجی تھی وہ اس کی اپنی مطبوعات تھیں یا تجارتی مکتبہ کی وہ کتابیں تھیں جو دوسرے مکتبوں کی اس میں موجود رہتی تھیں ہر شخص کو معلوم ہے ستمبر ۴۷ء کے ہنگامہ دہلی میں ادارہ کی مطبوعات اور تجارتی مکتبہ کی کتابوں کا اسٹاک جو ادارہ کے گودام میں محفوظ تھا اور جس کی مالیت کا تخمینہ دو لاکھ سے کسی طرح کم نہیں ہے اس طرح لٹا اور برباد ہوا کہ اس ذخیرہ کا ایک کاغذ بھی نہیں بچ سکا۔ اس اسٹاک کے ختم ہو جانے کے بعد یوں سمجھنا چاہیئے کہ ادارہ کا جو کچھ سرمایہ اور اس کی جو کچھ پونجی تھی وہ بے کم و کاست سب کی سب فنا ہو گئی ایک طرف ادارہ پر یہ ادبار آیا کہ وہ بالکل خالی ہاتھ رہ گیا اور دوسری جانب پورے ملک پر جو قیامت آئی اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ادارہ کے سینکڑوں محسنین و معاونین اور برہان کے خریدار گھر سے بے گھر اس طرح بچھڑ گئے کہ نہ ان کے اب پتے ہمارے پاس ہیں اور نہ ان کا کچھ اور حال ہی معلوم ہے علاوہ بریں ملک کی عام تباہی و بربادی اور پریشاں حالی کا نفسیاتی طور پر یہ اثر بھی ہوا کہ لوگوں کا ذوقِ مطالعہ جاتا رہا اور وہ زندگی کی حفاظت اور مستقبل کے تفکرات میں اس درجہ پاگل ہو گئے کہ علمی اور ٹھوس کتابوں کا مطالعہ کرنے کی طرف ان کو میلان ہی نہیں رہا۔

ادارہ کا اصل اثاثہ برباد ہو جانے اور مستقبل کے قطعاً غیر یقینی ہونے کے باوجود ہم نے محض اس خیال سے کہ ندوۃ المصنفین ایسے ادارہ کا وجود اگر پہلے مفید اور ضروری تھا تو اب ملک کی آزادی اور ۴۷ء کے عظیم انقلاب کے بعد ضروری اور ناگزیر ہو گیا ہے جنوری ۴۸ء سے انتہائی بے سر و سامانی کے عالم میں ادارہ کا کام پھر باقاعدہ شروع کر دیا اور برہان بھی حسب سابق شائع ہونے لگا خیال تھا کہ عارضی

طور پر مشکلات ضرور پیش آئیں گی لیکن اگر استقلال سے کام لیا گیا تو ان پر قابو پا سکیں گے مگر سخت افسوس ہے کہ یہ امید امیدِ خام ثابت ہوئی اور اب حالت یہ ہے کہ ہر مہینہ شدید خسارہ کے علاوہ کوئی صورت امید کی نظر نہیں آتی۔

ادارہ کی یہ مختصر حکایتِ سود و زیاں سننے کے بعد موجودہ حالات و ضروریات کا جائزہ لیجئے اور پھر سوچئے کہ اب آپ کا فرض کیا ہے! آج حالات یہ ہیں کہ ملک میں دو مملکتیں قائم ہیں ایک جگہ مسلمان خالب اقلیت میں ہیں۔ خوف زدہ اور ہراساں ہیں اور عنانِ اقتدار اس اکثریت کے ہاتھوں میں ہے جو گاندھی جی ایسی عظیم الشان شخصیت کی قربانی کے باوجود اب تک اپنے دل و دماغ کو جذبات عناد و منافرت سے پاک و صاف کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکی ہے اس صورتِ حال کا نتیجہ یہ ہو سکتا ہے کہ مسلمان اکثریت کے اقتدار سے مرعوب ہو کر اپنی تہذیب، اپنے کلچر، اپنی مذہبی روایات۔ اپنے علوم و فنون اور اپنے خصائص ملی سے ایسے ہی بے نیاز ہو جائیں جیسے کہ انگریزوں کی حکومت کے عہد میں ہو چلے تھے دوسری مملکت یعنی پاکستان میں سیاسی اقتدار مسلمانوں کے ہاتھوں میں ضرور ہے۔ لیکن مذہبی تعلیم کی کمی اور دینی فکر کے فقدان کے باعث قوی اندیشہ ہے کہ مسلمان اپنے ہمسایہ ممالک کی تقلید میں مغرب زدگی کی رو میں نہ بہ جائیں اور حکومت و سلطنت کا نشۂ اقتدار ان کو ان خصائص و روایات سے غافل نہ بنا دے جو ان کا سرمایۂ حیات ہیں اور جن کی وجہ سے قرآن نے ان کو " امۃً وسطاً " کا خطاب عطا فرمایا تھا۔

بہرحال مسلمان اقلیت میں ہوں یا اکثریت میں۔ ان کو مسلمان رہنا ہے اور اپنے علوم و فنون اور تہذیب و کلچر اور روایاتِ ملی کی حفاظت کرنا اور ترقی دینا ہے اور یہ صرف اس لئے نہیں کہ ان چیزوں کا تعلق ملی اور جماعتی حیثیت سے صرف مسلمانوں سے ہے بلکہ اس لئے بھی کہ یہ سب چیزیں انسانی تہذیب و ثقافت۔ اور علمی فکر و نظر کی تاریخ ارتقاء کا نہایت اہم اور روشن باب ہیں اور اس بنا پر ان کا تعلق صرف کسی ایک قوم یا جماعت سے نہیں بلکہ پوری دنیائے انسانیت سے ہے اور ان کا افادہ کسی خاص طبقہ یا

گروہ سے مخصوص نہیں بلکہ ہمہ ستان وعالمگیر ہے۔ البتہ ہاں! چونکہ مسلمان ان کے وارثِ اول ہیں اس لئے ان کی حفاظت و ترقی کی اولین مسئولیت اور ذمہ داری انھیں پر عائد ہوتی ہے بس اگر یہ صحیح ہے اور اس میں بھی کلام نہیں کہ یہ حفاظت و ترقی کا فرض پہلے اگر شدید تھا تو اب شدید تر ہوگیا ہے تو غور کیجئے کہ آپ اس فرض کو کس طرح انجام دے سکتے ہیں اور اس سلسلہ میں آپ سے وقت کے مطالبات و مقتضیات کیا ہیں؟

اس میں شک نہیں کہ آج مسلمان پریشان اور خستہ حال ضرور ہیں ایک جگہ وہ زندگی کے آسمان پر دن کو تارے دیکھ رہے ہیں اور دوسری جگہ انھیں حیات مستقبل کی شب انگیزیوں میں خورشید جہاں تاب کے طلوع کر آنے کا انتظار ہو رہا ہے لیکن انھیں اچھی طرح یہ سمجھ لینا چاہئے کہ وہ خواہ کسی حال میں ہوں اپنے مذہب۔ کلچر۔ تہذیب زبان اور خصائص ملی کی حفاظت اور اس کے لئے جدوجہد کے فرض سے کبھی معاف نہیں کئے جا سکتے کہ ان کی حیات ملی کا تار و پود انھیں سے تیار ہوتا ہے اور جب یہ بکھر گیا تو پھر حیات ملی کہاں رہی!

ہمارا ادارہ ایک خالص علمی۔ دینی اور کلچرل ادارہ ہے اس کا تعلق ہر اس مسلمان سے اور نہ صرف مسلمان سے بلکہ ہر اس لسان سے ہے جو اسلامیات پر اچھی اور مفید کتابیں اردو زبان میں پڑھنی چاہتا ہے۔ خواہ وہ کسی ملک کا باشندہ ہو اور خواہ کوئی مذہب رکھتا ہو اس موقع پر ہمیں گاندھی جی کا ایک واقعہ یاد آیا آپ بھی سنئے کس درجہ سبق آموز ہے۔

شفیق الرحمٰن صاحب قدوائی بی۔ اے جامعہ ملیہ اسلامیہ کے پرانے اور نہایت مخلص و پرجوش کارکن ہیں وہ بیان کرتے تھے کہ حکیم اجمل خاں مرحوم کی وفات کے بعد جامعہ کی مالی حالت نہایت سقیم ہوگئی تو اس پر غور کرنے کے لئے ڈاکٹر انصاری مرحوم کی کوٹھی پر ایک نمائندہ اجتماع ہوا جس میں خود گاندھی جی

بھی شریک تھے سب لوگ بہت مایوس تھے لیکن گاندھی جی نے ان کی ہمت بندھائی اور وعدہ کیا کہ میں تنہا جامعہ کے لئے ملک کا دورہ کروں گا اور روپیہ لاؤں گا سیٹھ جمنا لال بجاج اس زمانہ میں جامعہ کے خزانچی تھے ان کی زبان سے کہیں یہ نکل گیا کہ میں ہندوؤں میں چندہ کرنے جاتا ہوں تو کہتے ہیں کہ جامعہ کے نام سے "اسلامیہ" کا لفظ نکال کر فقط جامعہ ملیہ یا انڈین نیشنل یونیورسٹی" نام رکھدیا جائے تو ہم بھی چندہ دے سکتے ہیں ورنہ وہ تو صرف مسلمانوں کی درسگاہ ہے انھیں سے روپیہ لینا چاہیئے" قدوائی صاحب کا بیان ہے گاندھی جی یہ سنتے ہی بگڑ گئے اور خفا ہوکر بولے یہ بالکل غلط ہے ایسا ہرگز نہیں ہوگا میں نے تو بھائی محمد علی شوکت علی کے ساتھ مل کر اس کو قائم ہی اس لئے کیا تھا کہ یہاں اسلامی علوم و فنون اور اسلامی تہذیب و کلچر کی تعلیم دی جائے تاکہ کل میں اگر اپنے لڑکے دیوی داس کو ان چیزوں کی تعلیم دینا چاہوں تو اسے یہاں بھیج سکوں اگر یہ درسگاہ نیشنل ہوگئی تو ایک طالب علم جو اسلامیات کا مطالعہ کرنا چاہتا ہے وہ کہاں جائے ۔

بہرحال ادارہ کا حال اور وقت کا تقاضا و مطالبہ اب یہ دونوں آپ کے سامنے ہیں اور ادارہ کا نو دس سال کا برا بھلا کام بھی آپ کے پیش نظر ہے ۔ ان سب کی روشنی میں آپ کو فیصلہ کرنا چاہئے کہ یہ ادارہ قائم و باقی رہے یا اسے بھی اسی طرح مٹ جانا چاہئے جس طرح کہ گذشتہ دور بربریت میں تہذیب و ثقافت کی ہزاروں یادگاریں مٹ گئیں اگر جواب یہ ہے کہ اسے قائم رہنا چاہئے تو اب یہ ارشاد ہو کہ اس کا قیام کس صورت میں ممکن ہو سکتا ہے اور اس سلسلہ میں آپ کا کیا فرض ہے !

یہ واضح رہنا چاہئے کہ اگر ادارہ بند ہوگیا تو یوں تو دنیا فانی ہے یہاں کی کسی چیز کو دوام و قرار نہیں ہے لیکن ہاں ملک کا آئندہ مورخ اس واقعہ کا ذکر ضرور کریگا کہ ہندوستان میں آزادی اس شان سے آئی کہ قومی حکومت کے قائم ہوتے ہی خاص دارالسلطنت ہند میں ندوۃ المصنفین ایسے ادارہ کو ختم ہونا پڑا ۔ نہ ملک کی جمہوری حکومت اپنی ہی تہذیبی یادگار کو بچا سکی اور نہ مسلمان ہی اس کی حفاظت و بقا کے کفیل بن سکے ۔